(غلام گردش)

دوڈبے

پروفیسر نے کلاس کے بلیک بورڈ پر انگریزی زبان میں ''دوڈبے'' Two Boxes تحریر کیا۔ مڑ کر طالبعلموں سے پوچھا کہ ان لفظوں کا کیا مطلب ہے۔ تقریباً سو طلباء اور طالبات مختلف جوابات دیتے رہے۔ پروفیسر انتہائی شائستگی سے انکار کرتا رہا۔ بیس پچیس منٹ گزر گئے۔ کوئی بھی استاد کے ذہن کو نہ پڑھ پایا۔ سب خاموش ہو گئے۔ کلاس میں سکوت دیکھ کر پروفیسر ڈائس پر آیا۔ زور سے کہنے لگا یہ دوڈبے انسانی زندگی کا محور ہوتے ہیں۔ ان دوڈبوں کے درست توازن سے ملکوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔ یہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کا اصل فرق ہیں۔ انہی پر اقوام کی تقدیر کا انحصار ہوتا ہے۔ کسی طالبعلم کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ خاموشی مزید بڑھ گئی۔ سب میں تجسس تھا کہ پروفیسر بالاخر کہنا کیا چاہتا ہے۔ پروفیسر بات کرتا رہا۔ ایک ڈبے کا نام ہے نااہلی اور دوسرے ڈبے کا نام ہے بددیانتی یا کرپشن۔ اگر دیکھا جائے تو انسانی زندگی بھی اسی توازن کو قائم رکھنے ہی کا نام ہے۔ ایک ایسا توازن جسکے لیے ہر لمحے محنت ہوتی ہے۔ کسی سٹوڈنٹ کے پلے کچھ نہ پڑا۔ چہرے کے تاثرات دیکھ کر پروفیسر نے اپنا نکتہ مزید تفصیل سے بتانا شروع کر دیا۔ یہ کوئی معمولی کلاس روم نہیں تھا۔ ویسے تو کوئی بھی کلاس روم معمولی نہیں ہوتا۔ نیویارک یونیورسٹی کے بین لاقوامی تعلقات (International Ralations) کی پوسٹ گریجویٹ کلاس تھی۔ پوری دنیا کے طالبعلم اور طالبات موجود تھے۔ افریقہ سے لیکر لاطینی امریکہ تک۔ جنوبی ایشیاء سے لیکر آسٹریلیا تک، ہر خطے کے لوگ موجود تھے۔ پروفیسر اپنے شعبہ میں انتہائی پرتاثر شخصیت تھا۔ اسکا نام تھا مائیکل جون ولیمز۔

پروفیسر کا لہجہ طاقتور ہو رہا تھا۔ پوری دنیا صرف اور صرف دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ ایک طرح کی دو الماریاں ہیں، جنکے کواڑ بند رہتے ہیں۔ انہیں کھولنے والا اس ملک کا اصل سیاسی قائد ہوتا ہے۔ ڈبوں والی بات پر دوبارہ واپس آتے ہوئے کہنے لگا۔ ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ملک اس دنیا کی اصل تقسیم ہے۔ ہم تمام لوگ یہ تو دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں ہر چیز موجود ہے۔ انصاف پر مبنی نظام، وسائل کی کافی حد تک جائز تقسیم، قانون کی حکمرانی اور اپنے اپنے مذہبی، سیاسی رجہانات پر قائم رہنے کی اجازت۔ دوسری طرف، ہر چیز اُلٹ ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں طاقتور طبقہ ہر قانون سے بالاتر ہوتا ہے اور پسا ہوا طبقہ ہر سہولت سے محروم۔ امیر طبقہ، غریب طبقہ کو ہر دم بیوقوف بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ اسکے لیے خوبصورت ترین جذباتی جملے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر طاقتور طبقے کی بقا ہی اسی نکتے پر ہوتی ہے کہ اسکے ملک میں کسی قسم کا سیاسی، مذہبی، سماجی، لسانی، معاشرتی انصاف نہ ہو۔ ترقی پذیر ممالک سو فیصد اپنی مرضی سے ترقی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کرنے کیلئے انہیں اپنے معاشروں کی تشکیلِ نو کرنی پڑتی ہے۔ ان سے امیر طبقے کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ چنانچہ تیسری دنیا کے ممالک اپنی عوام کیلئے دلکش نعروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ جنکا کوئی عملی مطلب نہیں ہوتا۔ لوگوں کی زندگیاں اسی جذباتیت کی نظر کر دی جاتی ہیں۔ مگر صرف غریب لوگوں کی۔ امیر لوگ یا طبقہ اپنے ملک کے حالات کو جوں کا توں رکھتا ہے اور ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پروفیسر مزید بتانے لگا۔ پہلا ڈبہ یعنی نااہلیت کا کم ہونا از حد اہم ہے۔ جب کوئی سیاسی رہنما اقتدار میں آتا ہے۔ تو اسکی مرضی ہوتی

ہے کہ اردگرد کس سطح کے سیاستدان اور سرکاری ملازم اکٹھے کرے۔ترقی پذیر ممالک میں ملک کا مقتدر طبقہ ہمیشہ نااہلیت کو اہلیت پر ترجیح دیتا ہے۔اس لیے کہ قابل انسان کہیں بھی ہو،سنجیدہ سوالات اُٹھائیگا۔ایک مثبت سوچ کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کریگا۔حالات کو بہتر بنانے کی شعوری کوشش کرتا رہیگا۔اس ذہنی فکر کو تیسری دنیا میں کوئی پذیرائی نہیں ملتی۔ایک لائق انسان،اگر کسی طریقہ سے پالیسی سازی تک پہنچ جاتا ہے،تو گلے سڑے نظام کو کس حد تک تبدیل یا بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ قدم،ان ممالک کی ایلیٹ کیلئے ناقابل قبول ہوتا ہے۔لہذا انکے لیڈر ہمیشہ نااہل انسان کو اپنے قریب رکھتے ہیں۔آہستہ آہستہ یہ کم اہلیت والے لوگ،اپنے لیڈر کے اعصاب پر قابو پالیتے ہیں۔یہ کام کرنے کی بجائے،خوشامد،چاپلوسی،کاروائی اور شعبدہ بازی کو اپنا ایمان بنالیتے ہیں۔آہستہ آہستہ سب کچھ انکے ہاتھ میں آجاتا ہے۔اور معاشرے کا بگاڑ،بدستور جاری وساری رہتا ہے۔ہاں،اگر حادثاتی طور پر کوئی اہل شخص معاشرے کو بہتر بنانے کیلئے عملی اقدامات اُٹھائے،تو اسے بڑی صفائی سے راستے سے ہٹادیا جاتا ہے۔جس میں اس شخص کی جسمانی موت بھی شامل ہے۔تیسری دنیا کے قائدین پہلے ڈبے میں نااہلی کو اُوڑنا بچھونا بنالیتے ہیں۔لوگوں کیلئے انکے نعرے،انکی اصلیت سے بالکل متضاد ہوتے ہیں۔

پروفیسر ولیمز نے بورڈ پر لکھا۔دوسرا ڈبہ بددیانتی یا دیانتداری کا کم ہونا ہوتا ہے۔مضبوط طبقہ کیونکہ میرٹ کی بنیاد پر معاشرے میں ترقی نہیں کرتا۔بلکہ اس میں موروثیت،چوری،فراڈ اور دیگر عوامل شامل کار ہوتے ہیں۔لہذا یہ بددیانتی والے ڈبے کو ہمیشہ فروغ دیتے رہتے ہیں۔یعنی دیانتدار ہونا ان معاشروں میں جرم بنادیا جاتا ہے۔اس میں صرف پیسوں کے لحاظ سے کرپشن شامل نہیں،بلکہ ذہنی،نفسیاتی،جسمانی اور کردار کی بددیانتی بھی شامل ہوتی ہے۔یہ لوگ،اپنے جیسے ذہن کے لوگوں کو فروغ دیتے ہیں۔یہ ہر اس انسان کو خطرہ سمجھتے ہیں جن میں معمولی سی بھی دیانتداری موجود ہے۔بلکہ اگر انہیں خدشہ ہو کہ یہ انسان فکری طور پر تھوڑا سا ایماندار ہے یا مالی اعتبار سے اُجلا ہے،تو فوری طور پر اس سیاسی شخص یا سرکاری ملازم کو بیکار بنادیا جاتا ہے۔انہیں ویسے کرپشن سے کوئی خطرہ نہیں۔بلکہ یہ اسے اندرونی طور پر پسند کرتے ہیں۔مگر فکری آزادی اور دیانتداری کے اُصولوں کو اپنے معاشرے میں ہرگز ہرگز پنپنے کی اجازت نہیں دیتے۔

پروفیسر نے بات ختم کرتے ہوئے بورڈ پر مزید دو ڈبے بنائے اور انہیں بالکل قریب قریب کردیا۔ایک حکمران کا اصل کام ان دونوں ڈبوں میں توازن پیدا کرنا ہوتا ہے۔تیسری دنیا میں نااہلیت عروج پر ہوتی ہے۔اسکا کام ہوتا ہے کہ زیادہ اہلیت والی ٹیم کا انتخاب کرے یا کم اہلیت والی کا۔اس فیصلے سے اس قوم کا مستقبل جڑا ہوتا ہے۔یہ چناؤ ہرگز ہرگز آسان نہیں ہوتا۔ترقی یافتہ معاشروں میں سیاسی رہنماؤں کے لیے یہ فیصلہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔مسائل وہاں بھی ہوتے ہیں مگر انکی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔دوسرا ڈبہ میں بددیانتی کا راج ہوتا ہے۔کوئی بھی لیڈر اگر اس ڈبے میں سے کم ایماندار ٹیم یا بددیانت ٹیم کا انتخاب کرلیتا ہے تو ملک کا ترقی کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔وہاں ایک اور مسئلہ بھی ہے۔زیادہ اہلیت والے لوگ،بہت کم مکمل دیانتدار ہوتے ہیں۔مکمل طور پر ایماندار لوگ،اکثر اوقات بہت کم اہلیت کے حامل ہوتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔جواب یہ ہے کہ کوئی بھی قائدان دونوں ڈبوں کے توازن سے ٹیم بنالے،تو سب کا فائدہ ہوسکتا ہے۔مگر اسکی نوبت بہت کم آتی ہے۔کیونکہ ہر خطے میں مفادات،فیصلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔لیکچر تو خیر دو گھنٹے کا تھا۔اور تمام باتیں مکمل طور پر لکھی بھی نہیں جاسکتیں۔

پروفیسر مائیکل جون ولیمز کی باتوں کے بعد اگر آپ ہمارے بدقسمت خطے یا ملک کی طرف دیکھیں تو ہر چیز سمجھ آنی شروع ہو جاتی ہے۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ سمجھ آ جاتی ہے۔ ملک بننے کے نتیجے میں ہمارے پاس ایسے لیڈر بہت کم آئے ہیں جنہوں نے اہلیت اور دیانت کے مروجہ اُصولوں کے حساب سے اپنی ٹیم کا انتخاب کیا ہو۔ فیصلہ سازی کیسے ہوتی رہی۔ یہ ہر ایک کو معلوم ہے اور اس پر اب بحث کرنا لاحاصل ہے۔ پاکستان میں یہ ادنیٰ کھیل پہلے دن سے جاری وساری ہے۔ چلیے، مثال کے طور پر آپ گزشتہ، تین ادوار دیکھ لیجئے۔ معاملہ فہمی میں آسانی ہو جائیگی۔ پرویز مشرف کے دور کو دیکھیے۔ پرویز مشرف کو ایک ایسی ٹیم کی ضرورت تھی جو اسکی ہاں میں ہاں ملائے۔ اسکے شخصی اقتدار کو طول دینے کے علاوہ اور کوئی سوچ کا حامل نہ ہو۔ لہذا اس دور میں بھول کر بھی دیانتداری اور اہلیت کی کسوٹی پر لوگوں کا انتخاب نہ کیا گیا۔ آپ گراوٹ کی انتہا دیکھئے، کہ موصوف کو خوش کرنے کیلئے بڑے بڑے سینئر حضرات، سینکڑوں لوگوں کے سامنے بذاتِ خود رقص کرتے تھے۔ پرویز مشرف کو خوش کرنے کیلئے ہر جتن کر ڈالتے تھے۔ مگر پھر، اسی ٹیم نے پرویز مشرف کے ضعف کے دور میں اس سے ایسے دوری اختیار کی، جیسے لوگ طاعون سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنرل صاحب، ان دونوں ڈبوں میں توازن قائم کرنے میں ناکام رہے۔ عنان اقتدار، اسکے بعد مرکزی سطح پر زرداری صاحب کے ہاتھ آئی اور پنجاب کی صوبائی سطح پر اقتدار پی ایم ایل ن کے حوالے کیا گیا۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر ان پانچ برسوں میں مالی، اخلاقی اور سماجی سطح کے ایسے ایسے سکینڈل سامنے آئے، کہ لوگوں کی زبان گنگ ہو گئی۔ مگر نعرے جمہوریت، آئین کی بالادستی اور آمریت کے خلاف جدوجہد کے لگتے رہے۔ پنجاب کی سطح پر بھی یہ کھیل سفاک طریقے سے جاری رہا۔ شہباز شریف اسی شطرنج کے کھلاڑی تھے۔ ذاتی پسند، ناپسند اور وفاداری اصل بنیاد بنا دیے گئے۔ پروپیگنڈے کی مکمل مشین ترتیب دی گئی۔ جو ہر وقت شفافیت اور دھیلے کی کرپشن نہ ہونے کو سند عطا کرتی رہی۔ مگر معاملات جوں کے توں رہے۔ عوام کی سطح پر نعرے مستند ٹھہرے۔ جب یہی لوگ مرکز میں آئے تو پنجاب کی ساری علتیں مرکز میں منتقل ہو گئیں۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ وہاں کیا کیا ہوتا رہا اور کون کون کیا کیا کرتا رہا۔ اب عمران خان کی حکومت ہے۔ بدقسمتی سے اس نے بھی پرانی حکمتِ عملی ہی اپنائی۔ کم اہلیت والے لوگ مسند پر بٹھائے گئے اور دیانتداری کے دعوے صرف دعوے ہی رہ گئے۔ آج وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو پہلے ہوتا رہا۔ پروفیسر کی دو ڈبوں والی مثال پندرہ برس پہلے کے پاکستان کیلئے درست تھی اور آج کے ملک کیلئے بھی!

راؤ منظر حیات